رجسٹرڈ نمبر ۔ ۹۲۲

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے

سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۲	یکم دسمبر ۱۹۵۳ء	ایڈیٹر قاضی عبدالغفار	۲۳ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ	نمبر ۲۳

غلط اور صحیح قدم

معاصر قومی آواز نے ہمارے شائع کئے ہوئے سوالنامہ پر تنقید کرتے ہوئے اپنے اداریہ کو شروع ان الفاظ سے کیا ہے کہ:۔

جب کوئی تعمیری یا اصلاحی قدم اٹھایا جائے
تو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بہت
جانچ پرتال کر اٹھایا جائے۔

اس مشفقانہ تمہید کے بعد معاصر موصوف نے ہمارے پیش کئے ہوئے سوالات پر تبصرہ کیا ہے ایسی مشکلات بتانے کی کوشش کی ہے جو ان سوالات کا جواب دینے میں سدراہ ہوں گی۔ پھر فرمایا ہے کہ ہم جن لوگوں کے جوابات سے متعلق حالات کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں ان کو:۔

صرف تعداد ہی کا اندازہ نہیں کرنا ہوگا بلکہ فضا
کو بھی قیاس کے کانٹے پر تولنا ہوگا، یعنی یہ کہ
کس مقام پر کیسی فضا ہے اور اس کے اثرات
کیا ہیں اور فضا کیسے بدل سکتی ہے..... وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد معاصر موصوف نے ہمیں فہمائش کی ہے کہ:۔

"مصیبت یہ ہے کہ اس طرح کے سوال پوچھنا
لوگوں سے فرمائش کرنا ہے کہ تم اندھیرے
میں تیر چلاؤ۔"

اس فہمائش کے بعد کام کرنے کے "گہرائی وار" اور "پھیلاؤ وار" طریقے ہمیں بتلائے ہیں۔ آخر میں معاصر موصوف نے ان سوالات کو فضول قرار دیکر ہمیں جتایا ہے کہ بڑی ضرورت کارکن فراہم کرنے کی ہے، اُن میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کی ہے۔ ان کو ترتیب دینے کی ہے..... وغیرہ وغیرہ اور:۔

"یہ سب نازک ٹیکنیکل مسائل ہیں۔ بلا گہری
معلومات کے ان میں دخل نہیں دیا جا سکتا ہے"

ہم نے اس بہت نازک اور ٹیکنیکل اداریے کے ہر پہلو پر ـــــ اُس کے "پھیلاؤ" میں بھی اور "گہراؤ" میں بھی ـــــ بہت غور کیا۔ سوائے ایک بات کے سب باتیں ہماری سمجھ میں آگئیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئی وہ یہ ہے کہ ہمارے مقصد کو غلط سمجھ کر اس اداریے کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

ہماری زبان کے صفحات سے معزز معاصر کو اس بات کا پورا پورا علم ہوگا کہ آئندہ دسمبر میں انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر اپنی تمام شاخوں کے عہدیداروں کی ایک کانفرنس اسی غرض سے منعقد کرنے والا ہے تاکہ اس سوالنامہ میں جو سوال کئے گئے ہیں اُن کے تمام مشکل پہلوؤں پر کارگذاروں سے تبادلہ خیال کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ مقامی طور پر ہماری ہر شاخ کا ہر عہدہ دار اپنے مقام کی فضا کو قیاس کے کانٹے پر کس طرح تولتا ہے اور اگر اس فضا کو بدلنا ہے تو مقامی حالات کے لحاظ سے ایسی تبدیلی کی کیا تدابیر اختیار کرنا چاہتا ہے اور جن "نازک اور ٹیکنیکل" معاملات میں اُس کی معلومات ناقص ہے، اس میں کس طرح "گہراؤ" اور "پھیلاؤ" پیدا کیا جا سکتا ہے۔ سوالنامہ کا مقصد اندھیرے میں تیر چلانے کی دعوت نہ تھا اور نہ انجمن نے یہ طریقہ کار اختیار کرکے اندھیرے میں کوئی تیر چلایا ہے۔ بلکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیوں چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری شاخوں کے ذمہ دار کارگذار کن خطوط پر سوچ رہے ہیں۔

سوالنامہ کے جوابات۔ جو اس وقت تک وصول ہوئے ہیں ان میں کسی عہدیدار نے بھی اندھیرے میں تیر مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اُن میں سے بعض نے اپنی مشکلات کی طرف اشارے کئے ہیں، بعض نے خراب فضا کو درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، بعض نے یہ بتایا ہے کہ وہ کس حد تک مکاتب کی تحریک کو اپنے مقام پر آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ہمارے لئے اندھیرے میں تیر مارنے کے بالکل برعکس یہ بات ہے کہ مقامی کارگذاروں سے شخصی اتصال پیدا کرکے ہم اُن کے مقامی حالات اور مشکلات کا اندازہ کرلیں۔ ہر تحریک کو شروع کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ یہ عمل ٹیکنیکل مسائل کی نزاکت سے بھی ٹکراتا ہے یا نہیں، لیکن ہماری یہ تحریک بالکل اس بنیادی اصول کے مطابق ہے۔ جس کی طرف معاصر قومی آواز نے اپنی ابتدائی سطور میں واضح اشارہ کیا ہے یعنی:۔

جب کوئی تعمیری یا اصلاحی قدم اٹھایا جائے تو
اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ بہت جانچ
پڑتال کر اٹھایا جائے۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ معاصر موصوف کو شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہماری تجویز کا تعلق محض تعلیم بالغان سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے ہم نے اپنے سوالنامہ کا "پھیلاؤ" ایسا رکھا ہے کہ تعلیم کے حلقہ میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی تمام ممکنہ تدابیر اس کے اندر آتی ہیں۔ ہر پہلو پر تبادلہ خیال کے بعد ہی طے کرنا ہوگا کہ اس وقت کس پہلو پر زیادہ زور دیا جائے۔ "جانچ پڑتال" کے اس ابتدائی منزل پر معاصر "قومی آواز" کا زیر نظر تبصرہ ہمیں تو گمراہ نہیں کر سکا لیکن بہت سے اخبار پڑھنے والوں کے فہم و فکر میں انتشار پیدا کر سکتا ہے۔

خدا کے فضل سے انجمن کی شاخوں کے بہت سے کارگذار وہ ہیں جو مسائل کو سوچ سکتے ہیں تجربہ رکھتے ہیں اور علاقائی تحریک میں کام کرنے کے بعد اب سمجھنے لگے ہیں کہ انھیں کس سمت میں بڑھنا چاہیئے۔ ہم کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ان کے مشورے کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ سوالنامہ اور مجوزہ کانفرنس صرف ان احباب سے مشورہ حاصل کرنے کا مناسب ذریعہ ہیں اس مشورے سے پہلے ہم "غلط اور صحیح قدم" کی تفریق قائم کرنے میں عجلت نہیں کر سکتے۔

اردو اور الکشن

مقامی اداروں کے الیکشن ابھی ختم ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے مرکزی اور صوبائی قانون ساز جماعتوں کے الیکشنوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اردو کے بڑے بڑے مخالف بھی اپنے الیکشن کا کام نہ چلا سکے۔ اب پھر میونسپل انتخابات کا وہ تجربہ سامنے آیا ہے۔

اتر پردیش کے مقامی انتخابات میں کانگریس پارٹی کی کمزوری کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ ہر مخلص وطن پرست کے لئے افسوسناک ہے۔ لیکن اس صوبہ کی کانگریس سے صاف طور پر یہ کہنا ضروری ہے کہ :-

اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست!

علاوہ اُن افسوسناک غلطیوں کے جو امیدواروں کے انتخاب میں کی گئیں یہ بھی واقعہ ہے کہ اکثر مقامات پر کانگریس پارٹی کو عام مسلمانوں کی وہ تائید حاصل نہیں ہوئی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ اس کا سبب بھی بالکل واضح ہے۔ اتر پردیش کی کانگریس پارٹی کی ایک بڑی اکثریت نے اردو زبان کے ساتھ بہت غیر منصفانہ اور غیر ہمدردانہ طرز کار اختیار کیا ـــــ حتی کہ خود اپنے مرکز کے فیصلوں سے انحراف کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہوا۔

میونسپل انتخابات کے متعلق اردو کے متعدد حامیوں نے ہم پر زور دیا کہ ہم یہ تحریک شروع کریں کہ کوئی اردو دوست ان انتخابات میں حصہ نہ لے اور عوام کسی ایسے امیدوار کو ووٹ نہ دیں جو اردو کی حمایت کا وعدہ نہ کرے لیکن ہم نے کسی تحریک کو شروع کرنا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ انجمن نے ایک دستوری تحریک چلائی ہے جو اپنی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس لئے اسکو اپنی اختیار کئے ہوئے دستوری جدوجہد سے روگردان ہو کر کسی دوسری طرف اپنا رخ نہ بدلنا چاہیئے اور جہاں تک ہو سکے مقامی یا ریاستی سیاست سے اپنا دامن بچانا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی ایسی آواز بلند ہو جاتی اور اردو کا مسئلہ ان انتخابات کی ایک تیغ بنایا جاتا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ اردو والوں کی جتنی تائید کانگریس کو حاصل ہوئی وہ بھی نہ حاصل نہ ہوتی۔

ریاستی کانگریس کے نیتاؤں کو بار بار اپنی شکست کے عام اسباب اور خصوصاً اس سبب پر غور کرنا چاہیئے۔ اُن پر اس افسوسناک شکست کی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی تحریک

ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ حیدرآباد کے بعض گوشوں میں انجمن کی شاخ حیدرآباد کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کر کے ایک نیا ادارہ قائم کرنے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اگر حیدرآباد کے سوا کسی دوسرے صوبے اور خصوصاً اتر پردیش کے متعلق ہم یہ بات سنتے تو ہمیں تعجب نہ ہوتا۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر اور تفریق پیدا کر کے مرکزی قوت کو نقصان پہنچانے کا جو رجحان ہم نے اتر پردیش میں دیکھا ہے اس قسم کا رجحان ہم نے کبھی پہلے حیدرآباد میں نہیں دیکھا تھا۔ وہاں اردو کا محاذ ہمیشہ متحدہ رہا ہے اور اسی لئے حیدرآباد اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ انجمن کی شاخ کے علاوہ ایک قدیم ادارہ اور بھی حیدرآباد میں موجود ہے جو عرصہ سے زبان کی بہت اچھی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن اُس کے اور انجمن کی شاخ کے درمیان اس قسم کے کوئی تفریق کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

جہاں تک انجمن کی شاخ حیدرآباد کی عملی کمزوریوں کی شکایت کی جاتی ہے، شکایت کرنے والوں کو خود سوچنا چاہیئے کہ انھوں نے آج تک انجمن کی شاخ کی عملی تائید میں کتنے قدم اٹھائے ہیں۔ اس ادارے کی مالی حالت ہمیشہ خراب رہی، اُس کے کارگذاروں میں سوائے چند کے سب کرسی نشین رہنے کو محنت اور جدوجہد پر ترجیح دیتے رہے، اس کے جلسوں میں کورم کا پورا ہونا اکثر مشکل ہوتا ہے، باوجود ان کمزوریوں کے اُس کے معتمد کی جدوجہد جاری ہے اور جہاں تک اُن سے ہو سکا ہے انھوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔

بدقسمتی سے حیدرآباد کے اردو والوں پر ایک جمود اور احساس شکست کی کیفیت ابھی تک طاری ہے، اس کے علاوہ بعض "قومی" اداروں کے اندرونی انتشار نے عوام کے اندر ذہنی انتشار پیدا کر دیا ہے۔ لیڈری کے شوق نے بہت سے لیڈر پیدا کر دیئے ہیں اور لیڈروں کی کثرت نے عوام کے انتشار خیال میں اضافہ کیا ہے۔ بدنصیبی یہ ہے کہ بہت سے احباب اب یہ سمجھتے ہیں کہ صرف حکومت ہی کے دامن کے نیچے اُن کی نجات ہے۔ وہ ہر کام میں سرکاری اشاروں کا انتظار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اتر پردیش اور دوسرے صوبوں کے متعلق کہتے رہے ہیں۔ زبان کی ترقی و حفاظت کا مسئلہ اگر حکومت کے چشم کرم کا محتاج رہا تو یہ جمود کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور صرف اپنے بل پر آگے

بڑھنا ہوگا۔ اگر شاخ حیدرآباد کو عوام کی تائید حاصل ہو اور ایسے لوگ اس کی صفوں میں زیادہ جگہ نہ گھیریں جو کام نہیں کر سکتے یا سیاسی اور سرکاری مصلحتوں پر نظر رکھتے ہیں تو یہ ادارہ اردو زبان کا ایک بڑا مرکز بن سکتا ہے۔

ہم انجمن کی شاخ حیدرآباد کے ارباب کار سے بھی عرض کریں گے کہ وہ اپنی صفوں میں کچھ کام کرنے والے نوجوانوں کو شریک ہونے کی دعوت دیں جو بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو کر کام کر سکیں اور ایک لمحہ کے لئے یہ نہ سمجھیں کہ اردو کوئی شکست کھائی ہوئی زبان ہے۔ کوئی طاقت اردو زبان کو ختم نہیں کر سکتی تاآنکہ اردو کے حامی خود اپنی غفلت یا تساہل سے اس کا خاتمہ کر دیں۔

ہماری شاخوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ

(۱) شاخوں کی تنظیم اور ان کے دفتری اخراجات کے لئے مرکز سے کوئی مالی امداد نہیں دی جا سکتی۔ مرکز کے امداد کا مقررہ اصول یہ ہے کہ جس صورت میں کوئی شاخ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا کوئی کام شروع کرے (مثلاً مکاتب یا دار المطالعے) اور اس کام کے پورے اخراجات چندوں سے جمع نہ کر سکے تو اس کی ایسی آمدنی میں جو کمی ہوگی اس کو مرکز پورا کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کو اس بات کا اطمینان ہو کہ شاخ میں اپنے کاموں کے لئے سرمایہ جمع کرنے کی جد و جہد کرتی ہے۔ بہر صورت محض وظائف کی صورت میں مرکز شاخوں کی آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہ اصول ہی غلط ہے۔ اس قسم کے وظائف کا بہت برا اثر شاخوں کی قوت عمل پر پڑتا ہے۔

(۲) اب تک مرکز نے شاخوں سے کوئی مالی امداد حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی ہے حالانکہ تمام قومی تنظیموں میں شاخیں مرکز کے امداد کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ لیکن حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ شاید عنقریب مرکز کو بھی اپنی شاخوں سے یہ خواہش کرنی ہوگی کہ وہ مرکزی تنظیم کے لئے ایک مستقل مالی امداد دیا کریں۔

امداد کی خواہش کرنے سے پہلے انجمن کی شاخوں کے لئے ان اصولوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

علامہ برج موہن کیفی کی

۸۸ ویں سالگرہ

دہلی کے سرکردہ شہریوں کے ایک جلسہ میں چیف کمشنر کی چیرمینی میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو علامہ برج موہن کیفی دتاتریہ کی ۸۸ ویں سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں انتظام کرے گی۔ علامہ کیفی اردو کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ پروگرام میں ایک انڈو پاکستان مشاعرہ بھی ہوگا۔

اس مبارک تقریب کا پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے اور خیال ہے کہ وسط دسمبر میں یہ اجتماع ہوگا اور اس کو علامہ کیفی کے اعزاز میں زیادہ سے زیادہ شاندار بنایا جائے گا۔ دہلی میں ہر حلقہ کے لوگ اس تحریک میں بڑے شوق کے ساتھ شرکت کر رہے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور

ہم نے بہت افسوس کے ساتھ اخباروں میں علامہ مرحوم کی وفات کی خبر پڑھی۔ مرحوم و مغفور اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم کی ایک بہت اہم تہذیبی اور علمی تحریک کے علمبردار تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے استاد کی جانشینی کا حق بہت اچھی طرح ادا کیا۔ بلحاظ اپنے علوم و فن اور اپنی شخصی خوبیوں کے مرحوم اپنا بہت بڑا مقام رکھتے تھے اور اردو زبان پر بھی ان کے قلم نے ایسے احسانات کئے ہیں جو اردو زبان کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جائیں گے۔ علامہ مرحوم کے قلم نے ہماری زبان کے خزانوں کو اپنے شاہکاروں اور جواہر پاروں سے مالا مال کیا اور بلاشبہ آج ہم اور اردو زبان ان کے سوگوار ہیں۔ مرحوم کی رہنمائی میں سنجیدہ علم و فضل کا جو معیار دار المصنفین نے قائم کیا وہ آج اس ادارہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے چپے چپے پر علامہ مرحوم کا نقش قدم روشن رہے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

ہمیں یقین ہے کہ دار المصنفین کے فاضل اراکین علامہ شبلی اور علامہ سلیمان ندوی کی عظیم الشان روایات کو پوری طرح قائم رکھنے کے قابل ہیں اور ان کے بعد اپنی مخلصانہ جد و جہد سے ان روایات کی عظمت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

محفل ادب کے ایک بہت روشن شمع گل ہو گئی۔

ہلکے ہلکے اشارے

——— یہ خبر کراچی کی ہے کہ

یہاں کے ادبی حلقوں نے تجویز کیا ہے کہ اردو کے ساتھ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تجویز کے خلاف بطور احتجاج مولوی عبد الحق فاقہ مرگ شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں ایک ادیب نے کہا ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی عمر کا بیش قیمتی حصہ اردو کی ترقی و ترویج اور خدمت میں صرف کیا ہے۔ انہوں نے دامے درمے سخنے تو قربانی کی فقید المثال خدمات انجام دی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اردو کی قربان گاہ پر جان کی بازی لگا دی جائے لہٰذا مولوی صاحب کے لئے اس وقت مشورہ یہ ہے کہ وہ اردو اور صرف اردو کو تمام پاکستان کی قومی زبان منوانے کے لئے مرتے دم تک بھوک ہڑتال شروع کر دیں۔"

——— سبحان اللہ! کراچی کے ادبی حلقوں اور ادیبوں کی جودت طبع تو

ملاحظہ ہو !!

مولوی عبدالحق صاحب سے "مرن برت" کی فرمائش کرنے والے یہ نیک کام خود ہی کیوں شروع نہیں فرماتے !—— پاکستان میں طائر فکر کی اڑان صرف سیاسیات ہی تک محدود نہیں ہے—— زندگی کے ہر شعبہ میں فکر و نظر کے یہ شاہکار نظر آتے ہیں !!

—— نئی دہلی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستانی پنجاب اس وقت اردو صحافت کا بہت بڑا مرکز ہے یہاں اردو کو زبردست مقبولیت حاصل ہے۔ یکم جنوری ۱۹۵۱ء کو ۲۷ اردو روزنامے اور ایک ہندی روزنامہ۔ چھ پنجابی روزنامے۔ چار انگریزی رسالے تیس اردو رسالے۔ ۹۴۔ اردو ہفتہ وار پرچے پنجاب سے شائع ہوتے تھے۔ پنجابی کے رسالوں اور ہفتہ وار پرچوں کی تعداد صرف ۴۴ تھی اور ہندی کے ہفتہ وار پرچوں اور رسالوں کی مجموعی تعداد فقط ۴۳ تھی۔

—— اور یہ اُس صوبہ کا حال ہے جہاں اردو زبان والوں کی تعداد بہت ہی کم بھی جاتی ہے۔ البتہ پنجاب سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ پنجابی اردو ہی دامن سے لپٹے ہوئے ہیں۔

—— کسی زبان کی عام مقبولیت کا اندازہ بلاشبہ اخباروں اور رسالوں ہی سے ہوتا ہے—— یعنی جب اخبار اور رسالوں کو کافی پڑھنے والے ملتے ہیں تب ہی وہ جاری رہ سکتے ہیں—— اب اردو کے دشمنوں کو کون سمجھائے کہ—— ایں سعادت بزور بازو نیست !!

—— حکومت ہند کے شعبۂ نشر و اشاعت نے معلومات عامہ کی ایک کتاب بابت ۱۹۵۳ء شائع کی ہے جس کے صفحہ ۱۴۰ پر ان جرائد و رسائل کی تعداد بھی الگ الگ بتائی ہے جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں یوں تو بنگلہ، ہندی، گجراتی، تامل، تلگو، مراٹھی، اڑیا اور کناڑی سب ہی زبانوں میں اخبار نکلتے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اُن کا نام سرفہرست دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ملک کی تقسیم کے وقت یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کس زبان میں کتنے اخبارات نکلتے تھے اور اب ۱۹۵۳ء میں کتنے نکلتے ہیں۔

اردو زبان میں شائع ہونے والے جرائد و رسائل کی تعداد ۱۹۵۲ء کے وسط میں ۶۶۴ تھی جو اب بڑھ کر ایک سو ترسیٹھ تک پہنچ گئی ہے برخلاف اس کے ہندی زبان کے اخبارات کی تعداد جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ۳۰۵ تھی اب صرف ۱۲۵ ہے۔ بنگلہ میں پہلے ۱۵ اخبارات نکلتے تھے اب ۱۸ نکلتے ہیں۔ گجراتی اور مراٹھی اخبارات کی تعداد علی الترتیب ۲۵۔ اور ۲۷ سے بڑھ کر ۴۲۔ اور ۴۱ ہو گئی ہے سنسکرت کا کوئی اخبار یا رسالہ نہ پہلے نکلتا تھا اور نہ اب نکلتا ہے۔

—— ایک عام مثل ہے کہ "اعداد و شمار بولتے ہیں" مندرجہ بالا اعداد کیا بولتے ہیں یہ سوال ہم کس سے کریں؟ ٹنڈن جی سے؟ پنت جی سے؟ سمپورنانند جی سے؟ ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟

—— ہم سے اتر پردیش کے اردو دوست احباب دریافت کر رہے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ریاستی سرکار نے اپنی عدالتوں میں اردو کی درخواستیں قبول کرنے کی عام اجازت دے دی ہے اور کوئی ایسا سرکلر جاری کر دیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لئے ہم نے حکومت کے محکمۂ متعلقہ سے رجوع کیا لیکن وہاں سے ہمیں کوئی جواب نہیں ملتا۔ لہذا عرض ہے کہ جو احباب اس خبر کی صحت و عدم صحت کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے شہر یا حلقہ کے کسی ممبر اسمبلی کو زحمت دیں اور عرض کریں کہ اگر ایم۔ ایل۔ اے صاحب پارٹی ڈسپلن کی زنجیر کو ہلا سکتے ہیں تو کچھ نجات فرمائیں !—— ہم تو بہرحال حقیقت حال کی جستجو جاری رکھیں گے اور جب کسی ایسے سرکلر کی نقل حاصل ہوگی تو اسے عام اطلاع کے لئے شائع کر دیں گے۔

—— ایک نامہ نگار لکھتے ہیں کہ

مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن نے الہ آباد یونیورسٹی میں طلبا کے روبرو تقریر کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا کہ یوپی میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس سے قبل وہ کہتے تھے کہ یوپی میں صرف ہندی زبان بولی جاتی ہے چنانچہ جب ہندی کو سرکاری زبان بنایا گیا تو ٹنڈن جی اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے یہی کہا کہ پورے صوبہ کی زبان ہندی ہے۔ لیکن آج ٹنڈن جی کہتے ہیں کہ یوپی میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔

"ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

آج چونکہ ملک میں لسانی بنیادوں پر صوبوں کے قیام کے مطالبے نے زور پکڑ لیا ہے اور آندھرا کے قیام سے اس میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے اس لئے ٹنڈن کو خدشہ ہے کہ کہیں یوپی کے صوبہ کو بھی لسانی بنیاد پر تقسیم کرنے کا مطالبہ شروع نہ ہو جائے۔

—— ہم اپنے نامہ نگار کی خیال آرائی میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانیں اور ٹنڈن جی جانیں۔

—— کلکتہ کے ایک معاصر کا یہ بیان ہے کہ حیدرآباد کے سابق وزیر سری پھول چند گاندھی نے حیدرآباد کے اردو اخبارات کی مذمت کی جنہوں نے ان پر یہ الزام لگایا تھا کہ پولیس ایکشن کے زمانے میں ان کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت مظالم ہوئے—— اور اس الزام کی تردید فرماتے ہوئے اردو زبان کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ:

"میں اردو زبان کو بھولتا جا رہا ہوں، بلکہ میری کوشش یہ ہے کہ سارے ملک میں جتنی جلد ہو سکے اردو زبان ختم ہو جائے میں نے گذشتہ چار سال سے اردو اخبار و رسالوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے، صرف انگریزی کا دم بھرتا

زبان کے اخبار پڑھتا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اردو زبان سارے ملک میں ختم ہو جائے۔"

ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے معاصر کو یہ خبر کہاں سے ملی اور وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، لیکن اگر صحیح ہے تو تلیع نظر پھول چند جی کی جذباتی شدت کے مشکل یہ آپڑی ہے کہ موصوف کو اردو ختم کرنے سے پہلے اپنے ملک کے دستور میں ترمیم کرانی پڑے گی۔ اگر چار سال سے وہ اردو کا بائیکاٹ کرتے رہے اور ریاست حیدر آباد کے وزیر بھی رہے تو ملک کے دستور کی تعمیل کرنے کے اُس حلف کا کیا حشر ہوا جو ہر وزیر کو لینا پڑتا ہے ؟ ——— خدا کرے کلکتہ کے معاصر کی یہ خبر ہی غلط ہو!!

——— وزیر معلومات ڈاکٹر کیسکر نے اعلان کیا ہے کہ صوبہ آندھرا میں وجے واڑہ کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو کے مشاعرہ وغیرہ بھی نشر کئے جائیں گے۔

——— بہت بہت شکریہ۔ اسی سلسلہ میں اس نئے صوبہ میں اردو زبان کی ترقی اور حفاظت کے لئے اور کام بھی ہیں جو وہاں کی حکومت کو کرنے چاہئیں مثلاً گنتور کے اردو ٹریننگ اسکول کا از سر نو اجرا، جو بند کر دیا گیا۔ اور سب سے زیادہ حکومت کے نقشے میں اور وزرا کی مجلس میں اردو والوں کے قابل لحاظ اقلیت کی نمائندگی!

آندھرا کے حالات

بخدمت معتمد انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ

میں شال قبل کڑپہ میں تھا۔ اب ایک اصلاحی ادارے میں اردو فارسی کی خدمات کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آندھرا یونیورسٹی میں جب کوئی فارسی اور عربی کی نشست کا انتظام ہو وہاں پہنچ جاؤں گا۔

واقعی آپ نے وقت کے اہم تقاضے کو ہم خادمان اردو کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ ثقافتی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی بیداری کا دارومدار زبان کی ترویج دار تقا پر ہے۔

حالانکہ آندھرا میں بیس لاکھ کلمہ گو مسلمان رہتے بستے ہیں۔ مگر وہ ایسے بکھرے ہوئے ہیں کہ جن کے انتشار کو تنظیم کی کڑی میں منسلک کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان کی مالی حالات ناگفتہ بہ ہے۔ مذہبی زبوں حالی کے کیا کہنے۔ اُن کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ اختصار سے ان کا حال حسب ذیل ہے۔

اردو

آندھرا کے گیارہ ساڑھے گیارہ اضلاع کے مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ گو کہیں کہیں دور اُفتادہ قریہ جات کے نداف پیشہ مسلمانوں کی مادری زبان تلگو ہے تاہم یہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بول اور سمجھ تو ضرور لیتے ہیں۔ پورے صوبہ میں کوئی پانچ دس ہزار ایسے نداف ہوں تو بہت زیادہ ہے۔ مگر ان نداؤں میں بھی عربی اور اردو داں پائے جاتے ہیں۔

تمام اضلاع کے صدر مقامات اور تعلقہ جات کے صدر مقامات میں بھی اردو زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت یہ زبان سب کا مشترکہ ذریعۂ اظہار خیال ہے۔ حیدر آباد کے اطراف و اکناف کے اضلاع میں ہندو احباب بھی بہترین ادبائے اردو ہیں (جن میں کرنول کے بہترین جو ہندو ہیں بہترین ادیب و مقرر اردو ہیں)۔ اکثر ہندو خاندان ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔

ادبی اور نصابی اردو: اضلاع متوسطہ کو چھوڑ کر باقی کے اضلاع آندھرا میں مسلمان اردو کو صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں۔ بعض ان میں ایسے بھی ہیں جو مدارس تحتانیہ اور فوقانیہ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنائے ہوئے ہیں۔ علی الخصوص کڑپہ، کرنول اور گنتور کے اضلاع میں۔ مگر آندھرا صوبے کی تشکیل کے بعد کئی اردو داں احباب کا میلان زیادہ تر تلگو کی جانب ہو چلا ہے چونکہ یہی مقامی، علاقائی، دفتری اور سرکاری زبان واقع ہوئی ہے۔

کالجوں کا حال: رائل سیما کے اضلاع (کڑپہ، کرنول، اننت پور، چتور اور بلاری کے نئے کٹے حصے) میں جتنے کالج ہیں وہ اب تک مدراس یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔ ان کالجوں میں اردو تو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے صرف کرنول عثمانیہ کالج (جس کے بانی ڈاکٹر عبدالحق کرنولی ہیں) میں اردو، فارسی اور عربی میں بھی ثانوی اور خصوصی طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ اب اس رائل سیما کے علاقہ کے کالجوں کو بھی مدراس یونیورسٹی سے جدا کر کے آندھرا یونیورسٹی سے ملحق کیا جا رہا ہے۔ جہاں صرف اردو ہے اور کسی ایک کالج میں فارسی بھی ہے۔ مگر ہائی اسکول وغیرہ میں اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہے۔

دینی عربی مدارس: یوں تو ہر مقام میں ایک ایک دو دو معمولی دینی مدارس ہیں مگر اعلیٰ پیمانے پر چلائے جانے والے مدارس کم ہی نہیں بلکہ نایاب بھی ہیں۔ البتہ ایک مدرسہ قابل ذکر ہے وہ ہے جامعہ عربیہ محمدیہ رائے درگ (تعلقہ بلہاری) یہ بھی ان دنوں کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ اس کی خدمات اتنی وسیع نہیں جیسی کہ اس کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔

اردو ادارے: آل آندھرا اردو مجلس جس کا صدر مقام دھرنگ (مرحوم اسحاق نین) ہے۔ اس کے قابل معتمد عمومی جناب غالب فدائی صاحب ہیں۔ اس ادارے نے دو تین شاندار کانفرنسیں کی ہیں مگر اس کا کام ابھی تن دہی کے ساتھ شروع نہیں ہوا ہے۔ مگر خاطر خواہ طور پر خدمت نہ کرنے کا اعتراف ہے۔ چونکہ میں مہاجرین تمل ناڈو میں سے ایک ہوں

یوں تو ہر مقام پر آنی فانی عارضی نام نہاد اردو انجمنیں قائم ہیں مگر کوئی ٹھوس کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ اس لئے ان کے نام گنوانا فضول ہے۔ البتہ انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ کرنول میں قریب ماضی سے مستعد بخدمت ہے۔ جناب غیاث صاحب بی۔ اے (متعلم بی۔ ٹی) اس کے سکریٹری ہیں موصوف بہت کچھ کرتے آرہے ہیں۔

کڑپہ کے اردو ادارے: کڑپہ میونسپل مسلم ہائی اسکول ایک مدرسہ عالیہ

ہے جس میں چھٹویں جماعت سے میٹرک (ع. ا. ی. ی) تک تمام اسباق کیلئے اردو ہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ اس مدرسہ کو فروغ دینے کے لئے اور طلباء کے شمار کو بڑھانے کے لئے "مسلم ہائی اسکول انجمن طلبائے قدیم" بہت کام کرتی ہے۔ جس کی بنا خادم نے ڈالی تھی۔ اسی انجمن طلبائے قدیم کی جانب سے مشاعرے میلادی اجلاس اور مباحثے وغیرہ عمل میں آتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرنول میں انجمن مسلم نوجوانان بھی ہے جو تعلیم بالغان۔ تعلیم اطفال کے علیٰحدہ شعبے کھول کر باقاعدہ کام کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں "انجمن احباب سخن" بھی ماہانہ مشاعرے وغیرہ کرتی ہے۔

صحافت: نندیال تعلقہ کرنول سے ایک ماہنامہ بنام "آفاق" نکل رہا تھا جس کے مدیر نقاد سخن جناب سید عبدالستار عرشی صاحب تھے۔ وہ دو تین سال سے رکا ہوا ہے۔ حال ہی میں جناب عرشی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک اردو پریس بھی لے رہے ہیں اور پھر سے آفاق نشاۃ ثانی کا خیال رکھتے ہیں۔

ضلع کڑپہ کے ایک قصبہ سے جس کا نام نندپور ہے جناب تاباںؔ مخدومی ایک ماہنامہ نکال رہے تھے جس کا نام المخدوم ہے اب وہ بھی المرحوم ہو چکا ہے۔ اس کے سوا کوئی اردو پرچہ آندھرا میں نہیں ہے۔

پریس: کرنول اور ادھونی میں اردو کے پرنٹنگ پریس ہیں اس کے سوا کہیں نہیں ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ کرسمس کی تعطیلات میں کل آندھرا اردو مجلس کی جانب سے ایک کانفرنس کا انعقاد عمل میں لائیں۔ انشاء اللہ آپ کو بھی مدعو کرنے کا خیال ہے۔ آپ ہماری سرپرستی فرماتے رہیئے۔

"ہمیں لینی جواں ہیں تو جواں ہے اردو"

(نامہ نگار)

جے پور: ۱۰ نومبر کو ۱۲ بجے سہ پہر جمعیۃ علماء ہند جے پور نے شری اجیت پرشاد جین وزیر بحالیات گورنمنٹ ہند کو اپنے دفتر واقع حویلی نواب ممتاز الدولہ بہادر پر ایک عصرانہ دیا جس میں معززین و عمائدین شہر اور حکام وقت بلا تفریق مذہب و ملت بکثرت شریک تھے۔ ایڈریس سے پہلے مولوی احترام اللہ احمد صاحب شاغل عثمانی سکریٹری انجمن ترقی اردو جے پور نے اپنا حسب ذیل قطعہ شمیم صاحب جے پور کی زبانی سنوایا جو بیحد پسند کیا گیا۔

بے گھروں کو بسانے والے کے — گا رہی ہے خوشی میں دنیا گیت
شکلیں کس سے ہار جاتی ہیں — کیوں نہ بھارت میں ہو اہنسا کی جیت
ہاں مگر اک بیٹی بپتا ہی ہے — رہتی ہے کس کی ہو رہی ہے کریت
ہندو مسلم سبھی کی بیٹی سے — ایسی سندر ہے جس سبھی کو پریت
جس کی باتیں بہت ہی پیاری ہیں — جس کا ایک ایک بول ہے سنگیت
پر نہ جانے یہ کیا غضب ٹوٹا — سب محبت کی توڑ ڈالی ریت
جس کو پیدا کیا ہو بھارت نے — اُس کے ہو ساتھ ایسی سخت انیت
چاہتے ہیں اب کوئی ہو جائے — ایسے دشمن بھی ہیں کئی رجنیت
کوئی سنتا نہیں پکار اُس کی — ایک مدت گزر گئی ہے اس میں بیت
آپ شاید سمجھ گئے ہیں اُسے — ہے وہ اردو زبان بھارت پیت

اُس کے رہنے کا کیجئے پربندھ
وہ بھی گانے لگے تمہارے گیت

یہ قطعہ جو گلے میں پڑا ہوا۔ شاغل صاحب نے وزیر موصوف کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ ایڈریس کے بعد جب وزیر ممدوح نے ایڈریس کا جواب دیا تو اردو کے لئے فرمایا کہ "مجھ سے اردو کی بابت بھی کہا گیا ہے۔ اردو تو ملائی گئی ہے۔ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی۔ یہیں پروان چڑھی۔ اور اس میں علمی و ادبی بے شمار خزانے ہیں۔ وہ نہایت شیریں و شستہ زبان ہے۔ اس کی روانی خوبی۔ شیرینی اور ادبیت کو آپ اسی نظم میں دیکھ لیجئے جو سنائی گئی ہے۔ اور کس خیال کو کس انوکھے اسلوب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ملکی زبان بے شک ہندی ہے۔ مگر اردو کو حق حاصل ہے کہ ترقی کرے اور اس کی راہ پر ہرگز کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرنا چاہئے۔ اگر اردو مٹ گئی تو یہ ہندوستان کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہوگا۔ کچھ لوگ اس کو دوسری طرح سے سوچتے ہیں۔ مگر میں اور پنڈت نہرو اس خیال کے ہیں کہ یہ ہماری زبان ہے۔ اس کو برقرار ہی نہ رہنا چاہئے بلکہ ترقی کرنا چاہئے۔ کسی زبان کی مخالفت کرنا ملک کے لئے نقصان رساں ہے۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے اُن کو اسی زبان میں شروع سے آخر تک ضرور تعلیمی موقع دیا جائے۔ اردو ہندی آپس میں رقیب ہرگز نہیں ہے۔

گلاوٹھی: محمد ابراہیم صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اطلاع دیتے ہیں کہ :-

مجلس ادب گلاوٹھی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان طرحی مشاعرہ بروز شنبہ ۷ر نومبر ۱۹۵۳ء کو رات کے دس بجے بر مکان ڈپٹی عبدالواسع صاحب گلاوٹھی منعقد ہوا۔ جناب مولوی حمید الدین صاحب صدر کانگریس گلاوٹھی نے صدارت کی اور جناب حفیظ صاحب گلاوٹھی نے مشاعرہ کا افتتاح کیا۔ مقامی شعرائے کرام کے علاوہ بیرونی شعراء نے بھی شرکت فرمائی اور طرحی و غیر طرحی کلام سے سامعین کے ایک مجمع عظیم کو محظوظ فرمایا۔

رؤسا اور معتمد اصحاب قصبہ میں جناب وقار احمد صاحب۔ سید بشارت اللہ صاحب۔ جناب قاضی قدوس صاحب۔ جناب لالہ مکٹ لال صاحب۔ جناب رادھے لال صاحب۔ جناب سہندر پرکاش صاحب ٹیچر مفید عام اسکول گلاوٹھی۔ جناب جگدیش پرشاد صاحب۔ جناب حکیم حامد علی صاحب۔ جناب حکیم اللہ رکھے صاحب۔ جناب سورج بھان صاحب۔ جناب رادھے شیام صاحب۔ جناب بھگوت پرشاد صاحب۔ جناب نعیم الدین صاحب۔ جناب نیاز محمد خاں صاحب۔ جناب رشید احمد صاحب ممبر ٹاؤن ایریا کمیٹی گلاوٹھی۔ جناب قدم عزیز صاحب۔ جناب لالہ ریوتی سرن صاحب نے مشاعرے میں شرکت کی۔ مشاعرہ کی دلچسپی کا حال سن کر قصبہ کے ارد گرد کے مواضعات کے لوگ بھی

اس میں شریک ہوئے۔ سامعین کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب تھی۔ آخر میں میر مشاعرہ نے اپنے پرانے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

مراد آباد

محترمہ افسر قریشی صاحبہ اطلاع دیتی ہیں کہ ۲۲ نومبر سنہ ۵۲ء کو محترم مدنی صاحب اور مولانا فخر الدین صاحب نے مدرسہ بنات القریش کا افتتاح کیا تھا اس وقت مدرسہ میں ۷۰ لڑکیاں پڑھتی ہیں اور ۵ بہنیں رضاکارانہ طریقہ پر قرآن پاک کی تعلیم دیتی ہیں اور اردو میں خود پڑھاتی تھی۔ لیکن امی کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء سے ایک ادریس ۲۰ روپیہ ماہوار پر کام کر رہی ہیں مدرسہ کا کورس جمعیۃ علماء ہند کا شائع کیا ہوا ہے ۱ م ہر ماہ آنے مدرسہ کی فیس ہے۔ کچھ بہنیں مدرسہ کی خصوصی ممبر ہیں جو ایک روپیہ ماہوار چندہ دیتی ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مدرسہ اپنا بار آپ اٹھا سکتا ہے۔ ذرا ایثار کی ضرورت ہے۔ ورنہ ایسے ایسے تو کئی مدرسے مراد آباد میں چل سکتے ہیں۔

علی گڈھ

ادبی سوسائٹی علی گڈھ کی جانب سے ایک شبینہ مکتب کا افتتاح عمل میں آیا ہے۔ رسم افتتاح مولانا عبد الشاہد خاں صاحب شروانی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ضلع علی گڈھ نے ادا فرمائی۔ اس موقع پر چھتاری کمپاؤنڈ کے علاوہ شہر کی معزز ہستیوں نے بھی شرکت فرمائی۔ جناب منشی احمد علی صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء شہر علی گڈھ۔ خان بہادر حسن عباس صاحب زیدی ریٹائرڈ کلکٹر، بادی حسن صاحب وکیل۔ سید علی عباس صاحب زیدی وکیل۔ محمد قمر صاحب بی اے علیگ۔ منشی سید محمد علی صاحب۔ مولوی ظہیر احمد صاحب زیدی صدر ادارہ راؤ قیصر علی خاں صاحب۔ ابو محمد خاں صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

تلاوت کلام پاک کے بعد حضرت مولانا مولوی عبد الشاہد خاں صاحب شروانی کی زیر صدارت جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے حضرت مولانا موصوف کے ۸ سالہ ہونہار صاحبزادہ جمال میاں نے علامہ اقبال کی مشہور دعا "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" معصومانہ انداز میں پڑھی۔ پھر جناب اطہر صاحب قریشی نے ایک نظم پڑھی اس کے بعد محمد عمر خاں شمر جنرل سکریٹری ادبی سوسائٹی و مدیر "نو رس" نے شبینہ مکاتب کے اجراء کے متعلق ایک تمہیدی مضمون پڑھا جس میں انھوں نے بتایا کہ ادبی سوسائٹی نو ماہ کی جد وجہد کے بعد دینی اور اردو تعلیم کی ضرورت کے پیش نظر اس تمثیلی شبینہ مکتب کا اجرا کر رہی ہے اور ایک مزید دار المطالعہ بھی قائم کرنا ہے۔ شمر صاحب نے ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کیا۔ جنھوں نے ادبی سوسائٹی کی دامے قدمے اور سخنے امداد فرمائی۔

جناب سید علی عباس صاحب وکیل نے مسلمان بچوں کی تعلیمی پستی اور اس کی ضرورت پر ایک مختصر تقریر فرمائی۔ صدر محترم مولانا عبد الشاہد خاں صاحب شروانی نے ایک جامع اور نہایت مدلل فاضلانہ تقریر ارشاد فرمائی۔ جس میں شبینہ مکاتب کی ضرورت اور دینی و اردو تعلیم کی اہمیت پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے ہوئے بتلایا کہ گورنمنٹ نے جبری اور بیسک تعلیم کا نفاذ کر دیا ہے۔ سرکاری اسکولوں میں اردو اور مذہبی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے اگر یہی صورت حال رہی تو دس پندرہ برس کے بعد مسلمان صرف مردم شماری کے خانہ میں ضرور نظر آئیں گے۔ لیکن اُن کے دل و دماغ مسلمان نہیں ہوں گے۔ اس لئے مسلمانان ہند کا یہ اہم فرض ہے کہ وہ از خود اس صورت حال کے مقابلہ کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ شہر شہر، محلہ محلہ شبینہ مکاتب جاری کریں۔ اردو اور مذہبی تعلیم کا معقول انتظام کریں اس طرح ہماری کوششیں جاری رہیں تو ہم صرف اس بڑے خطرے سے بچ جائیں گے بلکہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو بھی برقرار رکھ سکیں گے اس شبینہ مکتب کے اجراء کو اس سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ آخر میں مولانا نے رسم افتتاح ادا فرمائی اور بچوں کو شیرینی وغیرہ تقسیم کی۔

میرٹھ

میرٹھ ۸ نومبر ۱۹۵۳ء کو گذری بازار میں، مزدوروں کا ایک مشاعرہ زیر صدارت جناب ماسٹر سندر لال صاحب" جنرل سکریٹری عوامی آزاد پور ڈ میرٹھ" منعقد ہوا۔ جن میں ترقی پسند شعراء نے شرکت فرمائی۔ شاعر انقلاب کوثر قریشی۔ شاعر مزدور نور تعلق، انجم جمالی، شہریار، مبارک صدیقی تشنہ، کبیل میاوی، حیران کشمیری۔ شری نواس شرما میونسپل کمشنر اور حضرت خنجر کے نام گرامی قابل ذکر ہیں۔

معززین میں کامریڈ نصرت سنگھ، سخاوت حسین صاحب، کامریڈ حکیم اللہ صاحب۔ مولانا اسد اللہ صاحب اور یحییٰ صاحب نے خاص طور پر شرکت فرمائی۔

مشاعرہ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شعراء نے صرف مزدور اور حالات حاضرہ پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ کوثر قریشی صاحب کی نظم "خودکشی" بے حد پسند کی گئی۔ بازار کے اہل ذوق مشاعرہ سے متاثر ہو کر نومبر کے آخر میں بھی دوسرا مشاعرہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

خورجہ

قمر تنویر صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو خورجہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اراکین انجمن ترقی اردو خورجہ کا ایک خصوصی جلسہ ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ بلند شہر میں ضلع کی شاخ قائم کی جائے نیز الہ آباد کی انجمن ترقی اردو کی اس تجویز کی بھی تائید کی گئی جو اس نے صوبائی شاخ بنانے کے سلسلے میں شروع کی ہے۔

یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ خورجہ میں جلد از جلد ایک شبینہ مدرسہ قائم کیا جائے۔

۱۰ نومبر کی شب میں بسلسلہ تشریف آوری حضرت کوثر میرٹھی ایڈیٹر "پرواز" انجمن ترقی اردو خورجہ کی طرف سے ایک مشاعرہ ادبی سوسائٹی کے دفتر میں منعقد ہوا جس کی صدارت حکیم عبد الحمید صاحب کلام قومی مسند

انجمن ترقی اردو خورجہ نے فرمائی۔ مقامی شعراء میں ابراہیم ناقب صاحب، قاضی فضل اللہ طرب ہوئی .... اور قمر تنویر صاحب کا کلام بہت پسند کیا گیا۔

(نامہ نگار)

انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک نئی اور مہتم بالشان کتاب

میر تقی میر

حیات اور شاعری

از:۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی،

میر کی شاعری میں "قیامت کا سا ہنگامہ" اور "آگ کی سی لپٹ" ہے۔ اس کے پیچھے ادب اور سماج، مواد اور ہیئت، جذبے اور فکر کا وہ گہرا رشتہ ہے جو تاریخی سچائیوں میں حسن اور زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان کا کلام "تیر نیم کش" کی حیثیت رکھتا ہے اور آج تک شاعری میں ان کی "میر مجلسی" مسلم ہے۔

لیکن اس موضوع پر ابھی تک کوئی محققانہ اور مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے دس سال کی محنت کے بعد اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے بڑے اہتمام سے چھاپا ہے۔ اس میں میر کی زندگی اور شاعری کے تمام پہلوؤں سے نہایت مدلل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور سماجی حقائق کی روشنی میں ضروری مواد کو اس حسن ترتیب سے جلوہ گر کیا گیا ہے کہ میر اور عہد میر کا ایک پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

یہ گراں مایہ تصنیف چھ سو (۶۰۰) صفحات پر مشتمل ہے اور دیدہ و دریافت اور تلاش و تحقیق کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں زیادہ تر نادر اور نایاب مواد استعمال کیا گیا ہے۔ اور جس مطبوعہ مواد سے مدد لی گئی ہے، اُسے بھی بے لاگ تنقید کے ساتھ نئی ترتیب اور تنظیم کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میر تقی میر (حیات اور شاعری) کے متعلق پروفیسر

ضیاء احمد بدایونی ریڈر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:۔

"فاضل مولف نے ایک مدت تک متعدد لائبریریوں سے استفادہ کر کے میر تقی میر کے سوانح کے متعلق تمام ممکن اور ضروری مواد بہم پہنچایا اور اس سے اپنی کتاب میں حسب ضرورت کام لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میر کی زندگی جس نازک اور پُر آشوب تاریخی ماحول سے گزری ہے، اس کی توضیح اور تشریح بھی نہایت مفصل اور مدلل انداز میں کی ہے اور دکھایا ہے کہ ان عوامل نے شاعر کی حیات اور خیالات پر کیا اثر ڈالا ہے۔ سوانحی اور تحقیقی پہلو کے علاوہ اس کا تنقیدی اور فنی حصہ بھی بیش قیمت معلومات کا خزینہ ہے۔ میر کی شاعری کے گوناگوں پہلو، مختلف اصناف سخن، دوسرے اکابر فن کی رائیں اور ان پر محاکمہ، اعتراضات اور جوابات غرض لائق مصنف نے کوئی ضروری بحث تشنہ نہیں چھوڑی۔ عبارت کا انداز سلاست اور ادبیت لئے ہوئے ہے اور بیان کی دلچسپی اور روانی آخر تک قائم رہتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب شیخ چاند کی تصنیف سودا سے رتبے میں کسی طرح کم نہیں ہے..... اور میری رائے میں یہ میر کے آثار و افکار کے سلسلہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔"

کاغذ، طباعت نہایت اعلیٰ۔ تعداد صفحات (۶۰۰)

احوالِ غالب

انجمن کی تازہ کتاب "احوال غالب" کے متعلق پاکستان ریڈیو سے حسب ذیل تقریر نشر کی گئی ہے:۔

"احوال غالب" دراصل ایک مجموعے کی پہلی جلد ہے جسے مختار الدین احمد صاحب ... ترتیب دے رہے ہیں۔ یہ مجموعہ تین جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلی جلد یعنی احوال غالب میں صرف غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کئے گئے ہیں اور یہی اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ دوسری جلد افکار غالب زیر طبع ہے۔ جس میں غالب کی شاعری، نثر نگاری اور اُس کے فن پر تنقید ہوگی۔ تیسری جلد گنجینۂ غالب زیر ترتیب ہے جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار اور خطوط جمع کئے گئے ہیں اور تصانیف کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں پر مضامین ہوں گے۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جب اس مجموعے کی تینوں جلدیں شائع ہو جائیں گی تو یہ غالب کی زندگی شاعری اور تصانیف کے بارے میں سب سے جامع اور مکمل مجموعہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اس مجموعے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ کسی ایک آدمی کی کاوش فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں تقریباً ان تمام حضرات کی نگارشات شامل ہیں۔ جنھوں نے غالب کی زندگی اور شاعری پر مفید اور اہم کام کئے ہیں۔ مختار الدین احمد صاحب نے جو اس مجموعے کے مرتب ہیں خود بھی غالب کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں بہت کارآمد ریسرچ کی ہے مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غالب کی زندگی، شاعری اور تصانیف پر ایسے جامع اور مکمل مجموعے کی ترتیب کا بیڑا اٹھایا ہے اور اسے نہایت کامیابی سے تکمیل تک پہنچایا۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ زیر نظر کتاب احوال غالب میں صرف غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کئے گئے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ یہ سب کے سب مضامین ہیں نہایت دلچسپ اور مفید معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور چند ایسے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں جس پر ابھی تک تحقیق کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ بعض مضامین ایسے ہیں جن میں غالب کی زندگی کے چند مشہور واقعات پر جدید اور تازہ ترین تحقیق کے نتائج پیش کئے گئے ہیں مثلاً ملا عبدالصمد جسے کئی جگہ غالب نے فارسی علم و ادب میں اپنا استاد بتایا ہے قاضی عبدالودود کا مضمون تحقیقاتی نقطہ نظر سے بھی اہم ہے۔ انھوں نے غالب

کے مختلف بیانات کو ایک ساتھ رکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ملا عبدالصمد کا کوئی وجود نہیں تھا اور غالب نے اپنے ادبی معرکوں میں اپنے حریفان سخن پر اپنی فوقیت ظاہر کرنے کے لیے یہ فرضی نام گھڑ لیا تھا اور یہ دعویٰ پیش کیا تھا کہ وہ فارسی علوم و ادب میں ایک ایرانی نژاد کے شاگرد ہیں۔ تحقیقاتی مضامین میں مولوی عبدالحق کا مضمون بعنوان "روئداد مقدمہ مرزا غالب" اور مولانا غلام رسول کا مضمون بعنوان "غالب کی خاندانی پنشن" بھی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا مضمون بعنوان "دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب" دہلی کی ایک ادبی انجمن سے غالب کے تعلقات ظاہر کرتا ہے۔ اور اس میں غالب کی ایک ایسی تحریر بھی شامل ہے جو اس نے اس انجمن کے ایک جلسے میں پڑھی تھی۔ "مرغالب در دیدہ دیگراں" خود مختار الدین احمد صاحب کا مضمون ہے اور اس میں ان بیانات کو جمع کیا گیا ہے جو غالب کے بارے میں ان کے بعض ہم عصروں کی نگارشات میں ملتے ہیں۔ ان بیانات میں سید غوث علی قلندر کا بیان جو سلسلہ قلندریہ کے ایک بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں غالب سے اپنی ملاقاتوں کا حال لکھا ہے اور اس سے غالب کی شخصیت کا ایک نسبتاً غیر معروف پہلو نظر کے سامنے آتا ہے۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کا بیان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے انھوں نے بھی غالب سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے جو خاصا دلچسپ ہے۔

مگر میرے خیال میں اس کتاب کے دلچسپ ترین مضامین وہ ہیں جو غالب کی خانگی زندگی سے متعلق ہیں۔ مالک رام صاحب کا مضمون مرزا غالب اور حمید احمد خاں صاحب کے دو مضمون۔ پہلا غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک اور دوسرا امراؤ بیگم یعنی غالب کی بیگم کے بارے میں۔ ان مضامین میں غالب کی نجی اور روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو نہایت حسین پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ غالب اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے۔ کیا پہنتے تھے۔ کیا کھاتے تھے۔ کن کن لوگوں سے ملتے تھے اور کس طرح ملتے تھے۔ بیوی اور گھر کے دوسرے عزیزوں سے ان کے تعلقات کیسے تھے۔ دوستوں کی محفلوں کا کیا نقشہ تھا۔ غرض کہ غالب کی روزمرہ زندگی کے معمول کے ہر پہلو پر بڑی دلچسپ معلومات کو اس طرح یکجا کیا گیا ہے کہ اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں تلے پھر جاتی ہے اور اس تصویر کا مرکزی کردار یعنی خود غالب ایک جیتے جاگتے کردار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اردو اور دوسری شاعروں میں سے شاید ایک بھی ایسا شاعر نہیں جس کی روزمرہ گھریلو زندگی کے بارے میں ایسے دلچسپ اور دلآویز مضامین لکھے گئے ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب کی شخصیت ہمارے نقادوں اور ہمارے اہل ادب طبقے کیلئے کتنی ہمہ گیر کشش اپنے اندر رکھتی ہے۔ وہ صرف اس کے فنی اور ادبی کارناموں ہی سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اس کی زندگی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو بھی انتہائی عقیدت اور دلبستگی سے قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات جمع کرنے کے سلسلے میں ایک بڑا مفید اور قابل قدر کام ہو چکا ہے۔ مگر مجھے ایک چیز کی ہمیشہ بہت کمی محسوس ہوئی ہے اور اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں بھی مجھے بار بار اس کمی کا خیال آتا رہا اور وہ یہ ہے کہ غالب کی ادبی شخصیت کی نشوونما اور ترتیب میں جن عناصر۔ فکری، سیاسی اور مذہبی اثرات نے حصہ لیا ان کے بارے میں ابھی تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ کہیں کہیں چند اشارات ضرور مل جاتے ہیں اور ان سے تھوڑے بہت نتائج بھی مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس ضمن میں پوری تفصیلی جانچ کی ضرورت ہے۔ غالب اپنے زمانے کے اہم ترین لوگوں سے متعلق رہے ہیں۔ ایسے لوگوں سے جو اس زمانے کی علمی، فکری، سیاسی اور مذہبی دنیا میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی صحبت میں رہ کر وہ اپنے زمانے کے رجحانات سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان رجحانات نے غالب کی ادبی شخصیت کی نشوونما اور ترتیب میں نمایاں حصہ لیا ہوگا۔ غالب کی نگارشات میں بھی ان کے اثرات ملتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان رجحانات سے غالب کے ذہنی ربط و تعلق کا سراغ لگایا جائے اور اس کا مکمل تجزیہ پیش کیا جائے۔

اردو

ریاست حیدرآباد میں کوئی صاحب پھول چند گاندھی ہیں جو ریاست کے سابق وزیر تعلیمات بتائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک بیان اخباروں میں نظر سے گزرا تو بڑا تعجب ہوا کہ یہ شخص کس ذہنیت کا ہے جس کے نام میں لفظ گاندھی بھی جڑا ہوا ہے اور وزارت تعلیم کے اہم عہدے پر وزیر بن کے کام بھی کر چکا ہے۔ پنڈت پھول چند گاندھی نے ریاست حیدرآباد کے اردو اخبارات کے اپنے بارے میں پروپیگنڈے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اردو اخبارات میں مجھ پر غلط الزام لگائے گئے ہیں کہ پولیس ایکشن کے زمانے میں میں نے مسلمانوں پر ظلم کیے ہیں" اور اس الزام سے چڑ کر پنڈت پھول چند نے فرمایا "میں اردو زبان کو نہ صرف بھولتا جا رہا ہوں، بلکہ میری یہ کوشش ہے کہ سارے ملک میں جتنی جلد ہو سکے، اردو زبان ختم ہو جائے، میں نے گذشتہ چار سال سے اردو اخبار اور رسالوں کے مطالعے کو بالکل ترک کر رکھا ہے، صرف انگریزی اور مرہٹی زبان کے اخبارات پڑھتا ہوں میری کوشش ہے کہ اردو زبان سارے ملک میں ختم ہو جائے۔"

پنڈت پھول چند گاندھی کی زبان سے پھول تو نہیں انگارے برس رہے ہیں پنڈت پھول چند گاندھی اردو زبان کو ہندوستان سے مٹانے کا جو خواب دیکھ رہے ہیں، اس کی تعبیر ان کی آنکھوں کے سامنے بہت بھیانک آ رہی ہے۔ اردو زبان ہندوستان میں ختم ہونے کے بجائے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اگر حکومت کی سرپرستی اسے حاصل نہ ہو تو کیا ہوا، عوام کی سرپرستی تو حاصل ہے اور انھیں کے سائے میں اردو پھل پھول رہی ہے، پروان چڑھ رہی ہے۔

حکومت ہند کے شعبۂ نشر و اشاعت نے عام معلومات کی کتاب بابت ۱۹۵۲ء شائع کی ہے جس کے صفحہ ۱۰۴ پر ان اخباروں اور رسالوں کی تعداد بھی الگ الگ بتائی ہے جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں، بنگلہ، ہندی، گجراتی، تلگو، تامل، مراٹھی، اڑیا اور کناڑی سب ہی زبانوں میں اخبارات نکلتے ہیں لیکن اردو زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اردو ہی کا نام کتاب میں سرفہرست دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا

گیا ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے ۱۹۴۷ء میں کس زبان میں کتنے اخبار نکلتے تھے اور اب ۱۹۵۳ء میں کتنے نکلتے ہیں؟

اردو زبان میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسالوں کی تعداد ۱۹۴۷ء کے وسط میں (۵۰۷) تھی جو اب بڑھ کر (۱۰۳۳) تک پہنچ گئی ہے۔ اردو زبان کے علاوہ ہندی کے اخبارات کی تعداد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو (۲۵۹) تھی جو اب صرف (۲۰۰) ہے۔ بنگالی میں پہلے (۶۵) اخبار نکلتے تھے، اب (۱۰) نکلتے ہیں۔ گجراتی اور تامل کی تعداد (۵۰) اور (۲۷) سے بڑھ کر (۹۴) اور (۱۴۱) ہو گئی ہے۔ انگریزی کا کوئی اخبار یا رسالہ جو پہلے نکلتا تھا، اب نکلتا ہے۔

امریکہ کی بہت مستند اور سرکاری لائبریری آف کانگریس نے پاکستان، ہندوستان، ملایا، لنکا، نیپال، سیام اور انڈونیشیا میں شائع ہونے والے اخبارات کی جو فہرست مرتب کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو مشرق بعید کی مقبول ترین زبان ہے۔ فہرست میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے تین ممالک، ہندوستان، پاکستان اور برما سے اردو کے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ بنگالی کے اخبارات صرف دو ملکوں ہندوستان اور پاکستان سے نکلتے ہیں۔ ہندی کے اخبارات صرف ہندوستان سے شائع ہوتے ہیں۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی پنجاب میں آج بھی اردو کا غلبہ ہے جبکہ تقریباً پورا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور صرف چند ہزار مسلمان آباد ہیں۔ اسی مشرقی پنجاب میں اوسطاً یہ ہے کہ ہندی کے ایک اخبار کے مقابلے میں اردو کے ۲۰ روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۵۱ء کو پنجاب میں پنجابی کے ۲ روزنامے، ہندی کا ایک اخبار اور اردو کے ۲۰ روزنامے شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ۹۴ ہفتہ وار اردو پرچے بھی تھے۔

پریس کمیشن کے اعلانیہ کے مطابق ہندوستان میں بعض اردو زبان کے اخبارات کی سرکولیشن (اشاعت) اتنی ہے جتنی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں حتیٰ کہ انگریزی زبان کا بھی کوئی روزنامہ یا رسالہ اردو زبان کے جریدے کی اشاعت کو نہیں پہنچتا!

کیا اس کے بعد بھی کوئی یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان نہیں ہے، پورے ملک کی لنگوا فرینکا نہیں ہے۔ اگر پنڈت پھول چند گاندھی اتنی مقبول ترین زبان کے خلاف جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو ان کی مخالفت اردو کو بس اتنا ہی نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا نقصان کسی قلعے کی فصیل پر پتنگ کے اڑنے سے پہنچ سکتا ہے! پنڈت پھول چند ہوں یا ٹنڈن جی یا کوئی دوسرے مہاشے، کاش وہ اندھوں کی اندھیری دنیا سے نکلتے اور دیکھتے کہ دنیا کیا سے کیا ہوئی جا رہی ہے اور وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا سمجھ رہے ہیں؟

ہندوستان میں جتنی فلمیں ہندی زبان کے نام پر بنائی جا رہی ہیں، ذرا ان کے مکالمے سنو، ایک ایک فقرے پر غور کرو، گانے سنو اور ان کے بولوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس زبان میں مکالمے ہوتے ہیں اور جس زبان میں گانے ہوتے ہیں وہ اردو ہی ہے، اور پھر ذرا سنتے جاؤ کہ ان پڑھ گنوار دیہاتی تک کو بھی سمجھتے ہیں، دل پسند دھنوں میں الاپتے ملیں گے۔ اگر وہ اردو بول نہیں سکتے، اردو سمجھ نہیں سکتے تو پھر فلم کیسے دیکھتے ہیں، اُن کے گانے کیسے گاتے ہیں؟

اردو کا مستقبل ہندوستان میں بہت شاندار ہے، بہت روشن ہے۔ اردو کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اردو اس ملک کی مٹی میں رچی بسی ہوئی ہے، اردو یہاں کی فضاؤں میں گھل مل گئی ہوئی ہے۔ اردو کو کون مٹا سکتا ہے یا ختم کر سکتا ہے؟

(آزاد ہند کلکتہ)

اردو کے ساتھ انصاف کیا جائے

مکرمی ایڈیٹر صاحب! تسلیم۔

اردو مخالفت کے چرچے سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے مگر یہ نکتہ ہنوز میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ سب آخر کیوں؟ اس کیوں کا جواب میں نے بارہا خود کو اوروں سے اور خود اردو مخالفین سے طلب کیا۔ مگر ان میں سے کوئی بھی میرے سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔ میری حیرت دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے اور یہ مسئلہ میرے لئے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر تو میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آیا یہ اردو مخالف طبقہ اپنے ملک کا باشی ہے یا کسی غیر ملک کا۔ اس لئے کہ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے باشی ہندوستان کی زبان کی بیخ کنی پر تُلے ہوئے ہیں۔

کیا ہمارے اردو کے مخالف دوستوں کو اس بات کا بھی پتہ نہیں کہ اردو کی پیدائش کہاں، کب اور کس حالت میں ہوئی تھی، اور یہ زبان کسی ایک قوم اور مذہب کے افراد کی اجارہ داری نہیں بلکہ مادرِ وطن کے ہر فرد کی محبوب زبان ہے۔ اس زبان کو ہندو اور سکھ بھائیوں نے اسی طرح نوازا ہے جس طرح مسلمانوں اور دوسروں نے؟

اردو کو علاقائی زبان تسلیم نہ کر کے ہماری حکومت نے جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ قطعی ایک انصاف پسند جمہوری حکومت کے شایانِ شان نہیں۔ اردو کا وطن ہندوستان ہے۔ یہ زبان یہاں صدیوں سے پھلتی پھولتی رہی ہے۔ اور سچ تو وہ زبان ہے جسے ہندو مسلم اتحاد کا شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آج جبکہ ملک آزاد ہو گیا، یہ بات قابلِ فخر ہے کہ یہاں کا نظام جمہوری ہے۔ جمہوریت کے اصول کے مطابق "یہاں کے ہر باشندے کو ترقی کرنے کا حق حاصل ہے"۔ اردو کا وطن بھی ہندوستان ہی ہے۔ اردو کو بھی ترقی کرنے کے مواقع ملنا چاہئیں۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ اردو کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ کہاں تک مناسب اور جمہوری ہے۔ کیا وطن باشی کو بے وطن کر دینا ہی جمہوریت کا خاصا ہے۔ اردو کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ بات کچھ بے تُکی ہے۔

میں اردو مخالف احباب سے استدعا کرتا ہوں کہ اردو کی راہ میں کانٹے نہ بنیں۔ اپنے دلوں کو تعصب کی لعنت سے پاک کر کے پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ ورنہ ہماری جمہوریت بدنام ہو جائے گی۔ میں صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں بعد آداب عرض کرتا ہوں کہ اردو کو علاقائی زبان تسلیم کر لیں۔ اس سے اردو داں طبقہ اور اردو ہی نہیں بلکہ ملک کے جمہوری دستور پر بھی بہت بڑا احسان ہوگا۔

(حبیب الزماں، رامپوری)

اردو کا وجود

ایک کلمۂ حق

جو صرف جواہر لال نہرو ہی کہہ سکتے ہیں

لکھنؤ ۳۰ نومبر دیوناگری رسم الخط میں اصلاح کرنے والی لکھنؤ کانفرنس کے نام وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندستان کی تمام زبانوں کے لئے ایک یکساں دیوناگری رسم الخط کی تجویز پر اظہار پسندیدگی کیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے تنبیہ کیا کہ اس سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ ایک زبان یا ایک رسم الخط کو ٹھونسنے کی کوششیں مشکلات پیدا کریں گی۔ وزیر اعظم نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ رومن اور فارسی رسم الخط کو باقی رکھنا چاہیے ان رسم الخطوں اور ہندی میں جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں یہ رسم الخط بالکل مختلف ہیں اور انھیں ہندی میں نہیں سمویا جا سکتا رومن رسم الخط تمام دنیا سے ہمارا تعلق قائم کرتا ہے اور فارسی رسم الخط کو یہاں کافی تعداد میں لوگ استعمال کرتے ہیں اور یہ خاص طور پر مغربی ایشیا اور ہمارے درمیان تعلقات میں معاون ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ میں اس وقت ہندی رسم الخط کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ریاستی وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس ہو رہی ہے جس کی صدارت نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کر رہے ہیں۔ کانفرنس کے لئے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر اعظم پنڈت نہرو نے پیغامات ارسال کئے ہیں وزیر اعظم کا پیغام حسب ذیل ہے۔

مجھے ابھی واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دیوناگری رسم الخط کانفرنس میں کس مسئلہ پر بحث کی جائے گی، زبان اور رسم الخط کے مسائل پر اسکالر و ماہرین غور کرتے ہیں اور اس کے بعد ان پر عام جلسوں اور جماعتوں میں غور کیا جاتا ہے میں نہیں جانتا کہ یہ بات ہوئی اور کچھ ایسی تجاویز ہیں۔ جن پر غور کیا جاتا ہے چونکہ مجھے اس سلسلے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس لئے میں گھاٹے میں ہوں۔ اگر کانفرنس میں تنہا رسم الخط کے سوال پر غور ہوگا تو میرے خیال میں اس کے دو حصے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تمام زبانیں یا زیادہ سے زیادہ زبانیں دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں دوسرے یہ کہ دیوناگری رسم الخط میں ایسا سدھار کیا جائے کہ اس میں دوسری ماڈرن زبانوں کے اوصاف پیدا ہو جائیں۔ یہ بات پسندیدہ ہے۔ رسم الخط کے معاملے میں ہندستان میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے اسکا اطلاق پہلے ان زبانوں پر ہو جو سنسکرت سے نکلی ہیں اور بعد ازاں دوسری زبانوں پر اگر ہم ایک متحدہ رسم الخط اختیار کر لیں تو اس سے دوسری زبانوں کے سیکھنے اور جاننے کے سلسلے میں رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے دلیل دینے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی رسم الخط اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ایک شخص الفاظ کے تلفظ کے لئے ان پر نقطہ وغیرہ نہ لگائے بہت سے اردو کے الفاظ ایسے ہیں جن کو دیوناگری رسم الخط میں صحیح طور پر نہیں لکھا جا سکتا۔ لیکن یہ کام آسان نہیں، یوگوسلاویہ میں جو ہندستان کے ایک بڑے صوبے سے زیادہ رقبہ والا ملک نہیں ہے۔ سرکاری زبانیں تین اور سرکاری رسم الخط دو ہیں۔ وزیر اعظم نے مزید کہا ہے کہ ہندستان میں ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ ایک اور زبان کو سیکھے۔

ہندستان میں دو رسم الخط یقیناً باقی رہنے چاہئیں۔ ایک رومن رسم الخط جس میں یورپ کی زبانیں اور انگریزی لکھی جاتی ہے اور اردو یا فارسی رسم الخط۔ ان رسم الخطوں اور ہندی کے درمیان کوئی جھگڑے کی وجہ نہیں ہو سکتی یہ بالکل مختلف ہیں اور انھیں ہندی میں سمویا نہیں جا سکتا۔ رومن رسم الخط کو دنیا سے تعلق قائم رکھنے کے لئے ضرور رکھنا چاہیے۔ فارسی رسم الخط کو کافی تعداد میں لوگ استعمال کرتے ہیں اور یہ ہمارے مغربی ایشیا کے تعلقات میں معاون ہے یہ ہندستان میں سیکڑوں سال تک رائج رہا ہے اور ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ قدرتی طور پر اس پر ہندی اور ناگری کا غلبہ ہوگا۔ لیکن اس کو برقرار رہنا چاہیے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ جس طرح رومن رسم الخط نے زندگی کے وسیع میدان میں حیات اور فکر کے سرمایہ میں اضافہ کیا اسی طرح ہمیں اپنی زندگی کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لئے اس کی حدود کے اندر ہی اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

کارگذاروں کی مجلس شوریٰ

الہ آباد یکم دسمبر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کے شفیق شاگرد حافظ شفیق الرحمٰن صاحب شفیق الہ آبادی نے اخبارات کو حسب ذیل بیان دیا ہے۔

انجمن ترقی اردو الہ آباد کی مجلس عاملہ میں جو ۲۰ ستمبر کو فخر قوم جناب حاجی محمد ذوالفقار اللہ صاحب صدر انجمن ترقی اردو کی کوٹھی نور منزل میں ہوا تھا میں نے الہ آباد کی شاخ کو صوبائی شاخ بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ جو متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ اسی سلسلے میں الہ آباد کے حامیان اردو کی طرف سے بھی ایک اپیل شائع کی گئی ہے۔ جس میں صوبائی شاخ کی تائید کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی گئی ہے کہ صوبائی شاخ تیج بہادر سپرو کی یادگار میں قائم کی جائے اس کی تحریک سب سے پہلے حضرت سراج الہ آبادی صاحب نے ۷ اگست کے جلسہ عام میں کی تھی۔ جو آغا محمود صاحب رانی منڈی کے دولت کدے پر ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری تجویز کی تائید میں ہر طرف سے حوصلہ افزا پیغامات وصول ہو رہے ہیں۔

ہمارے سامنے صوبائی شاخ کے قیام کے بعد بہت سے ایسے ٹھوس کام ہیں جن کا ہم پروپیگنڈہ نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ کام خود ایک بہت بڑا پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔

جمعیت علماء کی سیاسیات سے علیحدگی ایک قومی نقصان ہے اس کی کچھ تلافی اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ اہل جمعیت بنیادی مذہبی اور اردو تعلیم کے لئے مکتبوں کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا دیں اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا ایک مشاورتی اجلاس بھی بلائیں اور ماہرین تعلیم کے مشوروں سے مکتبوں کا ایک مکمل نصاب تیار کرائیں، موجودہ

نصاب جو جمعیت کی طرف سے شائع کیا گیا ہے کئی اعتبار سے نامکمل ہے اور اس میں کافی ترمیم کی گنجائش ہے۔

انجمن ترقی اردو ماہ دسمبر میں اپنی شاخوں کے اراکین کا جو مشاورتی اجلاس کرنا چاہتی ہے وہ نہایت اہم اور ضروری ہے۔ انجمن کو چاہیئے کہ تاریخ کا فوراً اعلان کردے تاکہ شرکت کرنے والوں کو اپنا پروگرام مرتب کرنے میں آسانی ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ انجمن کا یہ مشاورتی جلسہ لکھنؤ کے اس جلسہ کی طرح ہو جو اس وجہ سے بے نتیجہ رہا کہ جن نمائندوں نے لکھنؤ کے اس اجلاس میں شرکت کی تھی نہ تو ان میں ایک دوسرے ہی سے ملنے کا موقع ملا اور نہ وہ مرکزی انجمن کے صدر و سکریٹری سے اپنے مقامی حالات کے متعلق کچھ باتیں کرسکے۔

مرکزی انجمن کے طلب کئے ہوئے مشاورتی اجلاس کی یہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ شاخوں کے اراکین پہلے اس میں ایک دوسرے سے متعارف ہوں اور تبادلۂ خیال کریں۔ پھر انجمن کے صدر و سکریٹری سے ملکر اپنی دقتیں پیش کریں جو انھیں اردو کے سلسلے میں پیش آرہی ہیں۔ اس طرح اگر یہ کام ہوگا تو اجلاس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

کاروان معیشت

نجم الدین شکیب صاحب ایم اے نے لیو ہیوبرمین کی مشہور کتاب کا یہ ترجمہ بہت محنت اور توجہ سے کیا ہے اور انجمن نے اس کو شائع کرکے معاشیات کی تاریخ پر اردو زبان میں ایک قابل قدر کتاب کا اضافہ کردیا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دور سے معاشی جمہوریت کے اس شروع ہونے والے دور تک دنیا کے معاشی انقلاب کا سارا پس منظر ان صفحات میں پیش کردیا گیا ہے۔

قیمت مجلد ۶ روپیہ آٹھ آنے۔ غیر مجلد ۶ روپیہ

ترقی پسند ادب

یہ کتاب ترقی پسند شاعر سردار جعفری کی تصنیف ہے اور غالباً اس موضوع پر پہلی مستند کتاب ہے۔ اس میں ترقی پسند ادبی تحریک کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کا رشتہ بین الاقوامی ہے جو قومی حدود اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر انسانیت کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو انصاف محنت اور آزادی کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور کسی قوم کی برتری اور تفوق کا تصور اس نئی دنیا میں سب سے بڑا اگناہ ہے ان اوراق میں بہت سی غلط فہمیوں کو جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق پیدا ہوگئی ہیں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب بہترین ٹائپ میں اعلیٰ قسم کے چکنے کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

پرنٹر:۔ نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڈھ

پبلشر:۔ قاضی عبدالغفار۔ صدر دفتر انجمن ترقی اردو علی گڈھ